علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صد سالہ جشن کے فِنالے (دسمبر ۲۰۲۱) کی تقریب سے شروعات

گئی صدی میں علی گڑھ کا آخری چانسلر حکیم عبدالحمید مرحوم

از عابد رضا بیدار

ہر تعلیمی کام کرنے والے کی طرح حکیم عبدالحمید صاحب کے لیے بھی سرسید اور انکی تخلیق، علی گڑھ تحریک، قدرتاً ایک انسپریشن بنتی گئی۔ یہ تحریک جو بیسویں صدی کے نصفِ اول میں کمھلانے لگی تھی، نئے حالات میں نئی توانا فکر کے ساتھ زندہ ہوگئی۔ سرسید کی قیادت نے جس پیار اور اعتماد کے ساتھ انیسویں صدی کو سنبھال لیا تھا، علی گڑھ کے نئے فرزندوں نے اسی اعتماد کے ساتھ بیسویں صدی کے نصفِ آخر کو سنبھال لیا۔ حکیم صاحب سرسید کے ادارے سے اٹھتی ہوئی اس نئی تعلیمی اور تہذیبی فکر کی قدر و تحسین کرتے رہے۔

۱۹ویں صدی کا نصفِ آخر، سرسید کی قلم رو تھی؛ بیسویں صدی کے نصفِ آخر کو حکیم عبدالحمید کی قلم رو بننا تھا۔ سید بڑے مصنف تو تھے ہی، کئی اعتبار سے اردو ادب کے محسن، اور اردو کو ایک جدید زبان کا درجہ بخشنے والے پائیر نثر نگار بھی تھے۔ انہوں اردو کو بنیادی نثر نویسی کے اسلوب سے آشنا کیا اور گوناگوں جہتوں میں خیال انگیز تحریروں سے اردو کو مالا مال کر دیا۔ انہوں نے صرف لکھنے کی خاطر ہی نہیں لکھا بلکہ قلم تقاضا کرتا تھا اور خیال انھیں مجبور کرتا تھا کہ مجھے لکھو! وہ جہانِ تازہ کی نمود کے درپے تھے جس کے لئے افکارِ تازہ انھیں مضطرب رکھتے تھے، بے چین کئے رہتے تھے۔ اور یہ افکار وہ تھے جو، الگ الگ، بہتوں کے حصے میں آئے ہوں گے، لیکن سارے کے سارے، یکجا ایک ذہن میں پرشور تلاطم برپا کر کے، اپنے عہد کی ایک عظیم شخصیت کی تشکیل سازی کریں جو سماجی اصلاح کی فکر بھی کرے، مذہبی افکار کو بھی قرآنی تدبر سے ہم کنار کرے، مرجھاتے ہوئے زبان وادب کو بھی تازگی اور شادابی بخشے؛ اور، جہالت کے نتیجہ میں غریبی، اور غربت کے سبب بڑھتی ہوئی جہالت کو دور کرنے کے لیے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قوم و وطن کو نہال کرنے میں لگا دے! انھیں ان کے خالق و مالک نے قلم بھی دیا تھا زبان بھی؛ اور سب سے بڑھ کر سوچتا ہوا ذہن! مالک کے بیش قیمت عطیات سے انھوں نے کام بھی خوب لیا، اور ساری صلاحیتیں اپنے اردگرد پھیلی ظلمت اور ظلمت پسندی کو مٹانے میں لگا دیں۔ اس سب کے لیے تعلیم کو انھوں نے بنیادی اہمیت دی کیونکہ وہ یہ اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ علم ذہن کو صیقل کرتا ہے؛ اور، جہالت اور غریبی دونوں اس کے سامنے ٹک نہیں پاتے۔ انکی جدوجہد کے نتائج انکی زندگی ہی میں نکل آئے، اس طور سے کہ:

دو بھائیوں میں ایک، حالات کی گردش سے دبا کچلا، نحیف وناتواں، اپنے نئے حکمرانوں کے سامنے یا تو سر ڈالے رہتا تھا یا اپنی کھوئی ہوئی حکمرانی کے نشے میں طاقتور حاکموں سے دو دو ہاتھ کرنے کی فکر میں رہتا تھا اور ان کی لائی ہوئی تہذیب وتعلیم سے گریزاں! نتیجہ میں دونوں جہان کے خسارے میں تھا۔ دوسرے بھائی کو نہ کسی حکومت کا نشہ تھا، اور نہ نئے حکمرانوں کی نئی تہذیب سے کوئی بیر! ترقی کی دوڑ میں بڑا بھائی آگے نکل گیا، اور چھوٹا بھائی زخمی لہولہان پیروں سے جتنی تیز چل سکتا تھا چلتا رہا، لیکن تھکتا جاتا تھا، ہانپتا جاتا تھا۔ سرسید نے کمزور بھائی کا ہاتھ پکڑ کے اسے جینے کا سہارا دیا، ایسا کہ کچھ دن میں وہ سر اٹھا کے بات کرنے کے لائق ہو گیا، اور وطنِ عزیز کی ترقی کی دوڑ میں اپنے بھائی کا ساتھ دینے لگا۔

۱۸۵۷ء کے بعد سرسید اور انکی قوم کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا، ۱۹۴۷ء کے بعد حکیم عبدالحمید اور انکی قوم کو اسی قسم کے چیلنج قبول کرنے پڑے۔ اور، ۱۹ویں صدی کے ربعِ آخر میں سرسید کی قوم نے جس طرح اعتماد کی بازیابی کی مہم سر کر لی تھی، عبدالحمید کی قوم نے بھی ایک بار پھر اپنی بازیابی کر لی۔ سرسید نے اپنی مہم میں تعلیم پھیلانے کو ترقی کا بنیادی پتھر قرار دیا تھا، حکیم صاحب نے یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ اور، سرسید نے جس طرح یہ طے کر لیا تھا کہ جب تک تعلیمی میدان میں پچھڑے ہوئے، پورے طور سے آگے نہ بڑھ لیں، انھیں سیاست میں ہرگز حصہ نہیں لینا چاہئے۔ ایسے ہی حکیم صاحب نے اپنے لئے طے کر لیا، اور اپنے ہر مخلص کو اسی پر آمادہ کرتے رہے، کہ جب تک قوم کا جاہل اور غریب حصہ تعلیمی تمول سے پوری طرح فیضیاب نہ ہو لے، اسے سیاست میں نہیں پڑنا چاہیے؛ خاص کر قوم کا وہ حصہ جو اسکا دماغ ہے، جو پوری قوم کی ناؤ کا کھویا ہے! تعلیم پھیلانے کے لیے حکیم صاحب نے اپنی ساری دولت بھی وقف کر دی تھی، اور اپنی ساری صلاحیتیں بھی؛ اور، ہوتے ہوتے، یہ بھی طے کر لیا تھا کہ ان کے سماجی، مذہبی، تہذیبی خیالات جو بھی ہوں، ان خیالات کی اشاعت کے لیے وہ نہ تو کوئی تحریک چلائیں گے نہ کوئی مہم آزمائی کریں گے، مبادا اصل کام پرزد پڑ جائے! بلکہ ایک منزل وہ بھی آئی کہ انھوں نے اپنی عزیز ترین محبتوں (مطالعاتِ اسلامی، اور تاریخ طبِ اسلامی) کو بھی اس پر قربان کر دیا کہ کسی نہ کسی طور، قوم کی بے روزگاری جلد سے جلد دور ہو جائے۔ اگلے مرحلے پر اطمینان سے اپنے خیالات وافکار کی ترویج کی فکر کر لیں گے؛ وہ خود نہ سہی آنے والا زمانہ سہی! اور ان سب مرحلوں پر سرسید اور نیا علی گڑھ ان کو فیضان بخشتے رہے۔

حکیم صاحب نے ۱۹۷۹ء میں لکھا تھا :

''ہندوستان کے موجودہ مسلمانوں میں قیادت کا قحط ہے۔ سرسیدؒ نے ایک صدی پہلے یہ قیادت اپنی دور اندیشانہ تعلیمی سرگرمیوں سے مہیّا کر دی تھی؛ اب ان سرگرمیوں کا اثر مرورِ ایام سے تقریباً ختم ہو چکا ہے اور ہند میں مسلمانوں کا شیرازہ، ذہین قیادت نہ ہونے کی وجہ سے جس طرح بکھر رہا ہے اور جس طرح آج کل وہ بازیچۂ اطفال بنے ہوئے ہیں اسے دیکھ کر ہر دردمند مسلمان کا دل دُکھتا ہے۔''

پھر، ۱۹۸۰ء میں لکھا تھا :

ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی تجربے گنے چنے ہیں۔ علیگڑھ، دیوبند، ندوہ اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ ایسے ہیں جنھوں نے اپنا مستقل اثر چھوڑا ہے۔ سرسید علیہ الرحمتہ کا مقصدِ تعلیم، ذہانت کی تلاش اور تربیت نہ تھا، لیکن ان کے جوشِ ملّی نے بیسیوں ذہین اور باشعور افراد پیدا کر دیئے اور علیگڑھ اپنے اس وقت کے مقصدِ تعلیم اور ضمنی پیداوار میں کامیاب ہی رہا۔''

حکیم صاحب بیسویں صدی کے علی گڑھ کے آخری چانسلر (اگست ۱۹۹۶–م ۲۲/جولائی ۱۹۹۹ء) تھے۔ اس زمانہ میں ان کا ایک بار علی گڑھ جانا ہوا۔ اس موقع پر سفر سے دو دن قبل انھوں نے ایک تحریر لکھی تھی جس کا سرنامہ تھا : ''سفرِ علی گڑھ بموقع سرسیدؒ ڈے ۱۵/۱۰/۱۹۹۷ء''۔ اس میں حکیم صاحب نے لکھا تھا :

''سرسید کی اس تعلیمی نگری میں حاضری پہلے میرا خاصا معمول تھا، کیونکہ یہاں کی تعلیمی اور علمی برادری سے میرا گہرا تعلق رہا ہے، تعلیمی معاملات سے میرا ہمیشہ سے تعلق رہا ہے۔ اب تو وہ اتنا گہرا ہو چکا ہے جسے عام طور پر محسوس بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آپ یہ نہ

سمجھئے کہ آپ نے اپنی مادر تعلیمی کی جو خدمت اپنے غیر معمولی اعتماد کے ساتھ میرے سپرد کی ہے، میں اس سے غافل ہوں۔ میں اور میرے ساتھی اس یونیورسٹی کی ہی نہیں بلکہ تمام تعلیمی اور علمی مسائل پر، خصوصاً ہندوستان کے تعلیمی حالات پر باقاعدگی سے غور و بحث کرتے رہتے ہیں اور اس کے لئے جن معلومات اور اطلاعات کی ضرورت ہے، اس کا اہتمام بھی باقاعدہ کیا جا رہا ہے۔ آپ مجھ جیسے طبیب سے یہ توقع تو نہیں رکھ سکتے کہ وہ مرض کی صرف ظاہری علامتوں کو ہی رفع دفع کرتا رہے۔ مرض اور اس کے اصل سبب کو پالینے ہی میں امیدِ صحت کی جا سکتی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ آیئے ہم سب مل کر کوشش کریں کہ ہماری یونیورسٹی کا شمار پڑھائی اور ریسرچ دونوں اعتبار سے ہندوستان کی چند اعلاترین یونیورسٹیوں میں ہونے لگے۔ ہمیں ہر اس بات سے پرہیز کرنا چاہیئے جس کا اثر یونیورسٹی کے نظم و ضبط اس کے معیار اور طلبا کے مستقبل پر پڑے۔ ہر استاد اور ہر طالب علم کا مقصدِ زندگی یہی ہونا چاہیئے کہ ان کی وجہ سے یونیورسٹی کا نام روشن ہو۔

میرے عزیزو، کسبِ فضیلت کو علی گڑھ کا نشانِ امتیاز بناؤ، اکیسویں صدی بہت محنت و مقابلہ کا ماحول اپنے ساتھ لائے گی۔ ہمیں اس معرکہ کے لئے کمر کس لینی چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یونیورسٹی نے مسلمانوں کے اہم مسائل کی طرف وہ توجہ نہیں دی جو درکار تھی ۔ اسے تحقیق کا رخ بلا تاخیر اس طرف موڑ دینا چاہیئے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ رب العزت اس بڑے کام میں ان کی، آپ سب کی مدد کرے کہ یہ کام متحدہ کوشش چاہتا ہے۔

میرے خیال میں اس یونیورسٹی کے عظیم بانی کو یاد کرنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہم اخلاص اور محنت میں ان کی پیروی کریں۔"

حکیم صاحب کی زندگی اور ان کے کارناموں کا خیال آیا تو سب سے پہلے سرسید یاد آئے۔ اپنے بڑے کام چھیڑنے سے پہلے سرسید اور علی گڑھ، حکیم صاحب کا پہلا فیضان رہے ہوں گے، اس میں مجھے کوئی شک نہیں ہے۔ اور پھر بیس بائیس سال بھی نہیں گزرے تھے کہ سرسید، ۱۹۲۰ء میں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صورت میں زندہ ہو گئے؛ اور پھر ۱۹۴۹ء میں ذاکر حسین کی صورت میں زندہ ہوئے؛ اور، اور پھر، تیس سال بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ سید حامد کی شخصیت میں زندہ ہو گئے! کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق!

ذاکر صاحب سے حامد صاحب تک ایک قافلہ تھا جو رواں دواں رہا۔ یہ علی گڑھ کے فرزندوں کا قافلہ تھا۔ متوازی طور سے، ایک اکیلا راہی سرسید کی دلّی میں سرسید ہی کی راہ پر چل پڑا تھا؛ چلتا رہا اور سرسید کے ساتھ ساتھ سرسید تحریک کے فرزندوں، اپنے ہم عصروں سے بھی فیضان حاصل کرتا رہا۔ یہ علی گڑھ کے آخری چانسلر تھے: مرحوم و مغفور حکیم عبد الحمید!

☆☆☆

کتابدار کی ذمہ داری

کتابوں کی قدر و قیمت آنکنے کا فرض منصبی اب کتابداروں کی ذمہ داری ٹھہری۔ مگر آج کے کتابدار کو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ فضول کاموں کے نمٹنے سے سر اٹھا سکے۔ نہ اسے کتابوں کو، مغل کتابداری کی اصطلاح میں، خاصۂ اول یا خاصۂ دوم ٹھہرانے کی اہلیت، نہ آس پاس کے اکابر کو اس کی ضرورت! پڑھنے کیا کتاب کو سونگھنے کا بھی وقت نہیں ملتا، چہ جائیکہ اچھی کتابوں کو، پڑھنے والوں کے علم میں لانا، اور انھیں پڑھوانا، اچھی اور بڑی کتابوں کے پڑھنے کی ترغیب دینا! نتیجہ میں بھائی رنگا ناتھن کراہتے رہ جاتے ہیں، کہ ارے میرے کتابدارو! میری سنو! ہر کتاب کا کوئی نہ کوئی پڑھنے والا کبھی نہ کبھی میسر آ ہی جاتا ہے: اگر وہ آنکلا تو پھر کہاں سے کتاب میسر کراؤ گے۔ اس لئے کتاب کو ویڈ آؤٹ کرنے میں بھی احتیاط کرو اور مصنف کی طرح ریڈر کو بھی پہلی فرصت میں خارج ہرگز نہ کرو، خاص طور سے خاصۂ اول کے مصنف اور ریڈر!

قدیم مضمون میں انگنت قیمتی، بہت قیمتی، اور کبھی کبھی **بہت زیادہ** قیمتی کتابیں اور نکات چھپے پڑے رہتے ہیں، (ہم کبھی کبھی اس صورتحال کے لئے **مدفون** کا لفظ استعمال کر لیتے ہیں)، اب یہ کسی جاگرت کتابدار کا فرض ہے کہ وہ ان قیمتی کتابوں کو ان کے صحیح قدردانوں تک پہنچائیں۔ تاکہ دودفتیوں میں محفوظ کسی غریب مصنف کا سارا ذہنی سرمایہ جس پر کبھی کبھی اپنی ساری عمر صرف کی ہوگی، ضائع نہ جائے۔

کتابوں کی طرح، ان میں محفوظ خاصۂ اول کے افکار بھی اسی صورتحال کا شکار ہیں۔ اول تو خاصۂ اول پہچاننے کی فرصت ہی کسے! اور فرصت ہو تو **پہچوانے** کی جسارت، جرأت یا سکت کسے!

☆☆☆

غـــزل

– از منیر فرشوری

یہ سانحہ تو مری زندگی میں ہونا ہی تھا
کہ اسکو پانا بھی تھا، اور اسکو کھونا بھی تھا

جو اس نے، جاتے ہوئے دے دیئے تھے کچھ موتی
تو فرض تھا کہ انھیں یاد میں پِرونا بھی تھا

خموش ہونٹوں سے جب اسنے ایک بات کہی
وہ بات کیوں نہ سنی، دل کو اسکا رونا بھی تھا

نہ سو سکے یہ مقدر کی بات ہے ورنہ
حسین یادوں کا اک نرم سا بچھونا بھی تھا

منیر نام کا دھبہ تھا اسکے آنچل پر
خلوصِ دل کا تقاضا تھا، اسکو دھونا بھی تھا

☆☆☆

اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سرسید احمد خاں کا مرتبہ

ڈاکٹر سید مقبول احمد مرحوم، بانی ڈائریکٹر ویسٹ ایشین اسٹڈیز، علی گڑھ

ہندستان میں نہ تو اختلاف مذاہب کا فرق آج تک مٹ سکا ہے اور نہ فقہی طور پر سب متحد ہو سکی ہے۔ ہمارے ملک میں حنفی اور شافعی مسلک کے پیرو آج بھی اسی سختی سے اپنے اپنے مذہب پر عمل کرتے ہیں، جس طرح شاہ ولی اللہ کے زمانے میں کیا کرتے تھے۔ اس کی سب سے اہم وجہ اجتہاد اور اجماع امت کا مسئلہ ہے۔ اس پر ہم آج تک متفق نہیں ہو پائی ہے۔ عرب دنیا میں حالات قدرے بہتر ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں اپنے تیونس کے دورے میں مجھے وہاں کے چند علما سے اس سوال پر گفتگو کرنے کا موقعہ ملا۔ چونکہ تیونس کے اکثر باشندے **مالکی** ہیں، میں نے دریافت کیا کہ ایسی صورت میں آپ کے مفتی **شافعی** مسلک کے ماننے والے کیوں ہیں؟ جواب دیا گیا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ وہاں کے مالکی مذہب کے ماننے والے عوام اس بات سے پریشان ہیں کہ ان کا مفتی شافعی ہے۔ ہندستان میں اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے اور خصوصاً شمالی ہند میں جہاں اکثر مسلمان **حنفی** ہیں کہ اگر ان کا مفتی **شافعی** ہو تو غالباً یہ بات مسلمانوں میں خلفشار کا باعث بن جائے۔

● عام طور سے سرسید کے افکار و خیالات کو دو خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک ان کے سیاسی افکار جن کی بنا پر ان پر سخت الزامات لگائے جاتے ہیں کہ وہ انگریزوں کی حکومت کے حامی و طرفدار تھے۔ دوسرے ان کے مذہبی افکار اور تعلیم جدید کو فروغ دینے میں ان کا رول۔ آخر الذکر کی بنا پر ان پر اپنے زمانے کے کوتاہ نظر لوگوں نے بے بنیاد الزامات لگائے اور ان کو دہریہ، نیچری وغیرہ جیسے القاب عطا فرمائے۔ بعض حضرات انھیں فرقہ پرست ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، صرف اس لیے کہ ان کی کامل توجہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر مبذول تھی۔ میری رائے میں سرسید کی زندگی یا ان کے خیالات کا اس طرح بٹوارہ کرنا مناسب نہیں۔ وہ تمام مسائل کو جو مسلمانوں کو درپیش تھے ایک مجموعی نظر سے دیکھتے تھے، اور ان کا صرف ایک مطمح نظر تھا کہ کسی طرح مسلمان اپنے خواب غفلت سے جاگے، اپنی داخلی کمزوریوں اور برائیوں کو پہچانے اور انھیں دور کرنے کی کوشش کرے۔ وہ یہ تاڑ گئے تھے کہ پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔ اور سمجھ گئے تھے کہ جب تک مسلمان پس ماندہ ہیں، اور مغربی تعلیم سے محروم، ایسے میں انگریزوں سے مقابلہ کرنا بے سود ہے۔ نئی تعلیم ہی انھیں، ذہنی طور پر طاقتور اور اقتصادی طور پر مضبوط بنا سکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے جدید تعلیم کی ترویج کو اپنی زندگی کا اولین مقصد بنایا۔ اس زمانے کے مسلمان ایک عبوری دور سے گزر رہے تھے۔ روایت پرستی، مذہبی تعصب اور ثقافتی پس ماندگی ان پر صدیوں سے حاوی تھی۔ اس لیے انھیں قدیم دور سے نکال کر جدید دور میں لانا تھا۔ انگریزوں سے نفرت کی وجہ سیاسی بھی تھی اور مذہبی بھی، اور یہ اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ انگریز کی ہر بات کو کفر و الحاد سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ یہ تمام خرابیاں نئی تعلیم ہی سے دور ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ سرسید نے انگلستان کی قدیم یونیورسٹیوں کا دورہ کیا اور وہاں کی طرز تعلیم کا معائنہ کیا۔ اور علی گڑھ کالج اسی نہج پر قائم کیا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کے کالجوں اور علی گڑھ یونیورسٹی میں اتنی مشابہت ہے کہ جب میں ۱۹۵۱ء میں آکسفورڈ میں اپنی تعلیم مکمل کر کے علی گڑھ پہنچا تو وہاں کی عمارتیں مثلاً وکٹوریہ گیٹ سرسید ہال اور طلبہ کے دوسرے رہائشی ہال دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں دوبارہ آکسفورڈ پہنچ گیا ہوں۔ اگر ہم سرسید کے صرف انھیں علمی کارناموں کو لیں اور ان کے باقی اصلاحی کارناموں کو نظر انداز کر دیں تو میں سمجھتا ہوں کہ سرسید کا ہم پر یہ سب سے بڑا احسان تھا۔ اگر مسلمانوں میں یہ تعلیمی انقلاب نہ آتا تو شاید ہم آج بھی عہد وسطی کی تنگ و تاریک گلیوں میں بھٹکتے نظر آتے۔

نئی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ میں روشن خیالی بھی پھیلانا ضروری ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں آج بھی بچے نئی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، لیکن یہ لازمی نہیں کہ سب میں روشن خیالی پیدا ہو جائے اور ان کے ذہنوں سے وہ مذہبی تعصّبات کوتاہ نظری اور ذات پات کے تعصب دور ہو جائیں جو ان کے گھر کے ماحول یا فرقہ پرست سیاسی جماعتوں کے پروپیگنڈے کے اثر سے ان کے ذہنوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ سرسید نے لوگوں کے تعصّبات اور اخلاق و عادات کو بھی اپنی تحریروں اور تقریروں سے طنز و مزاح کے انداز میں درست کرنے کی کوشش کی اور ایک حد تک کامیاب رہے۔

مسلمان صدیوں سے قدامت پسندی اور مذہبی تعصّبات میں گرفتار تھے، جو ان کی زندگی کے ہر گوشہ پر حاوی تھے۔ ایسی صورت میں اجتہاد اور ریفارمیشن کی ضرورت تھی۔ سرسید نے اس تحریک کی بھی ابتدا کی۔ اگر انھوں نے دینی عقائد میں اجتہاد کی کوشش کی تو وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان تقلید کی عادت چھوڑ دیں اور عقل و ادراک سے ہر مسئلہ پر غور کریں جیسا کہ اسلام کی تعلیم ہے۔

نوکریوں اور ملازمتوں کا مسئلہ تو سارے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مسئلہ ہے۔ آزادی کے چالیس سال گزر جانے کے بعد بھی ہم اپنے تعلیمی معمے کو حل نہیں کر پائے ہیں۔ لارڈ میکالے نے تعلیم کا جو ڈھانچہ انگریزی حکومت کے نقطۂ نظر سے تیار کیا تھا، آج بھی ہم اسی پر چل رہے ہیں، بلکہ اس کے غلام ہو گئے ہیں۔ اور اس نظام تعلیم میں کوئی قابل قدر تبدیلی نہیں کر سکے ہیں۔ البتہ ہر پنج سالہ یوجنا کی ابتدا میں تعلیمی نعرے ضرور تراشے جاتے ہیں، تعلیمی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور یہ نعرے بھی بہت جلد مدھم پڑ جاتے ہیں۔

سرسید کی اصلاحی تحریک کا دوسرا پہلو مذہبی تعصّبات، غلط قسم کے عقائد اور رسوم و رواج کو معاشرہ سے ختم کرنا تھا، جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ صدیوں سے مسلمان انھیں مانتے چلے آ رہے تھے، اور انھیں مذہب سے زیادہ اہمیت دے رکھی تھی۔

آٹھویں صدی میں عرب مسلمان سندھ پہنچے اور اس کے بعد ترک مسلمان۔ یہ سب اپنے ساتھ اسلام لائے۔ لیکن اس سر زمین پر اسلام کی ایک عوامی شکل نے بھی نشو و نما پائی، یعنی تصوف نے۔ یہاں کے صوفیوں ولیوں اور متقی پرہیز گار لوگوں نے، مذہبی فرق کو مٹانے اور مخصوص سیاسی حالات کے مدنظر، آپس میں بھائی چارہ رواداری اور پیار محبت کی تلقین کی، عوامی بولیوں کو فروغ دیا، موسیقی اور ادب میں نئی راہیں کھولیں۔ اس طرح ہمارے ملک میں ایک نئی ملی جلی تہذیب کی داغ بیل ڈالی۔ اس سلسلے میں ترک اور مغل حکمرانوں کی کوششیں بھی قابل ستایش ہیں۔ اکبر نے دین کے سلسلے میں جو کوشش کی وہ تو ناکام رہی لیکن یہ سعی دارا شکوہ تک جاری رہی اور اس کی عالمانہ تحریروں پر ختم ہوئی۔ اسی دور میں بھگتوں نے بھی پیار محبت رواداری اور ایکتا کا سبق دیا۔ تصوف اور بھکتی میں بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں، اس لیے ان کی عوام میں ایک خاص اپیل تھی۔ اس دور میں فرقہ پرستی کا شائبہ تک نہ تھا۔ نہ تو عوام میں اور نہ حکومت کی سطح پر۔

سرسید نے ہندستان کے ہندو اور مسلمانوں کو دلہن کی دو آنکھوں سے تشبیہ دی تھی۔ ان میں نہ تو کوئی تعصب تھا اور نہ فرقہ پرستی پھیلانے کی کوشش۔ بیسویں صدی کے اوائل سے ہمارے رہنما بھی انگریزوں کی پیدا کردہ اس خلیج کے شکار ہو گئے۔ ان میں سے بعض نے مذہب کی تجدید پر زور دیا اور مذہب کو سیاسی

مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ کیوں کہ یہی ایک سب سے طاقتور اپیل تھی جو عوام کے جذبات کو ابھارنے میں کامیاب ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر یہ رہنما صوفیوں اور بھکتوں کا راستہ اختیار کرتے اور ملی جلی تہذیب پر زور دیتے تو شاید فرقہ پرستی زور نہ پکڑتی۔ لیکن آزادی کی تحریک کے زمانے میں بھی کئی سیاسی جماعتیں محض مذہبی بنیادوں پر قائم ہوئیں اور نتیجہ ملک کی تقسیم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس تقسیم کے جو نتائج نکلے ان سے ہم سب واقف ہیں۔ آج مذہبی تعصب اور فرقہ پرستی اپنے حدود سے گزر گئے ہیں اور ان پر قابو پانا مشکل ہو گیا ہے۔

اسلامی تہذیب کی طرح ہندو تہذیب میں بھی آج تک کوئی اطمینان بخش اصلاح نہیں ہو پائی ہے۔ کسی رہبر نے عوام کو یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ مذہب انسان کا اپنا اور اپنے خدا کے درمیان ایک نجی معاملہ ہے۔ نہ یہ بتانے کی کوشش کی کہ غلط قسم کے رسم و رواج قوم کے لیے مضر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گوتم بدھ سے لے کر مہاتما گاندھی تک کئی مصلحین نے معاشی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ راجا رام موہن رائے نے ستی کے خلاف ایک حد تک آواز اٹھائی، مہاتما گاندھی نے سوسائٹی میں ہریجنوں کا درجہ اونچا کرنے کی کوشش کی اور ڈاکٹر امبیڈکر نے اس سلسلے میں ایک نئی راہ دکھائی۔ ان کے علاوہ کئی تحریکیں بھی قائم ہوئیں، مثلاً آریہ سماج، برہمو سماج وغیرہ۔ لیکن ان سب میں مذہبی رنگ شامل تھا۔ جسے صحیح معنوں میں مذہبی اصلاح کہتے ہیں، وہ آج تک کامیاب نہ ہو سکی۔

ہم نے سیاسی آزادی تو حاصل کر لی ہے، مگر ذہنی طور پر اب بھی مقید ہیں۔ مذہب اپنی جگہ بہت اہم چیز ہے۔ مذہب ان سوالوں کا جواب اور حل پیش کرتا ہے جو عقل انسانی کے دائرے سے باہر ہیں، نہ تو فلسفہ اور نہ سائنس ان سوالات کا جواب دے پائے ہیں اور نہ کبھی دے پائیں گے۔ زندگی کا حقیقی مقصد کیا ہے، حقیقت کیا ہے، ہم کہاں سے آئے ہیں، ہمارا اس کائنات میں وجود کیوں ہے اور موت کے بعد ہم کہاں ہوں گے۔ یہ وہ سوالات ہیں جو عقل و مشاہدہ کے دائرے سے باہر ہیں۔ مختلف مذاہب نے ان کا جواب اپنے اپنے انداز میں دیا ہے، اور پیغمبروں، صوفیوں اور ریشیوں نے اس راہ میں روشنی دکھائی ہے۔ اس روشنی سے متحیر اور پریشان عقل کم از کم سکون پاتی ہے، اور روح کو اطمینان ہوتا ہے۔ مذہب کی ابتدا چند عقائد اور اصولوں سے ہوتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ اس کے ارد گرد رسم و رواج پرورش پانے لگتے ہیں، اور اصل تعلیم ان کے سمندر میں غرق ہو جاتی ہے، اور عوام انھیں رسموں کو مذہب سمجھنے لگتے ہیں۔ اور ظاہری رسوم مذاہب کے تضاد اور اختلافات کا سبب بن جاتے ہیں۔ اور جب یہ تعصبات سخت عقائد یعنی Dogma کی شکل میں اختیار کر لیتے ہیں تو وہاں سے فرقہ پرستی کی لعنت شروع ہوتی ہے۔

ہمارے رہنماؤں نے کبھی اس حقیقت کو واضح نہیں کیا کہ مذہب اچھی چیز ہوتی ہے، مگر فرقہ پرستی بری چیز ہے۔ برخلاف اس کے انھوں نے مذہبی جذبہ کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور آج بھی کر رہے ہیں۔

ہمارے رہنماؤں نے سیکولرزم کا مطلب کچھ اس طرح توڑ کر پیش کیا کہ اس کے اصل معنی و مفہوم تو خبط ہو گئے اور ایک نیا مفہوم پیدا ہو گیا، جو نہ لغوی لحاظ سے صحیح ہے اور نہ تاریخی لحاظ سے۔ سیکولرزم کے معنی یہ بتائے گئے کہ تمام مذاہب کے ساتھ مساوات کا برتاؤ ہو اور حکومت ان کی سرپرستی کرے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے سیکولرزم ازمنہ وسطی کے یورپ کی ایک تحریک تھی۔ جس میں دنیوی معاملات کو مذہبی معاملات سے جدا کرنا شامل تھا۔ لفظ ''سیکولر'' کے معنی ''دنیوی معاملات سے متعلق باتیں'' ہیں۔

جہاں تک اسلامی معاشرہ کا تعلق ہے، پچھلے سو سال کی تاریخ میں مجھے صرف سرسید ہی ایک ایسے شخص نظر آتے ہیں جنھوں نے نہایت نیک دلی اور ہمت سے مسلمانوں میں سماجی اور مذہبی اصلاح کی کوشش کی، لیکن انھیں اس مشن میں مکمل کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ ایک طرف تو وہ مسلمانوں کے تعلیمی، معاشی اور سماجی حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہے اور دوسری طرف اسلام کی حمایت میں اسے دشمنوں کی ضرب سے بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی خیال کے ما تحت انھوں نے انگلستان کا سفر بھی کیا۔ سرسید کو دہریہ، نیچری اور کافر کہہ کر لوگوں نے ان کی اصلاحی تحریک پر پردہ ڈال دیا۔ ان کو فرقہ پرست اور انگریزوں کا پٹھو بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، مگر اس میں کوئی سچائی نہ تھی۔ ان کے بعد اب تک کسی مسلمان مفکر یا مصلح نے ان بنیادی مسائل کی طرف توجہ نہیں کی جن سے سرسید دوچار تھے۔ اکثر و بیشتر مفکرین نے مذہبی جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی اور ان سے کھیلتے رہے۔ مذہب اسلام کو اس طرح توڑ موڑ کر اپنے نقطۂ نظر سے پیش کیا کہ عوام اسی کو اصل مذہب سمجھنے لگے۔ اسلامی تعلیمات یعنی برادری، رواداری، انسانیت، مساوات اور ترقی پسندی یہ سب ان مختلف توضیحات میں مفقود ہو جاتی ہیں، اور فروعی باتوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اگر سماجی اور معاشی ترقی کے سلسلے میں کوئی اصلاحی قدم اٹھایا جاتا ہے تو مذہبی رہنما، سیاست داں اور حکمراں اس کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ نتیجہ میں ہم بجائے ترقی کرنے کے اور تنزل کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو اصلاحات کو قبول کر لیتے ہیں اور نئے قوانین میں زیادہ رخنہ انداز نہیں ہوتی ہے۔ لیکن ہندستان کے مسلمان آج ایسے مخمصے میں پھنسے ہوئے ہیں، جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ ایک طرف مذہبی رہنما ہر ترقی پسند قدم کی مخالفت کرتے ہیں تو دوسری طرف حاکم جماعت خود کوئی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں جس طرح وہ ہندوؤں کے سلسلے میں قدم اٹھا لیتی ہے۔ چنانچہ باوجود آزادی کے مسلمان اسی سماجی سطح پر ہیں جہاں وہ انیسویں صدی میں تھے۔

برخلاف اس کے دنیائے اسلام کے دوسرے ممالک رفتہ رفتہ اپنے قوانین بدل رہے ہیں اور اپنے سماج کو تیزی سے ترقی کے راستے پر لے جا رہے ہیں۔ ان میں مصر، پاکستان، تیونس، شام اور عراق قابل ذکر ہیں۔ بیسویں صدی میں صرف دو علاقے ایسے ہیں جہاں مکمل تبدیلی واقع ہوئی ہے، ایک ترکی اور دوسرا سنٹرل ایشیا۔ ترکی میں تو عرب دشمنی اور سلاطین عثمانیہ کے رجعت پسند سیاسی رول کی وجہ سے اسلامی قوانین بدل دیے گئے اور سلطنت اور خلافت دونوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ مگر سنٹرل ایشیا میں شیوعیت کے زیر اثر مذہب پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ وہاں بھی اسلامی قانون ایک حد تک بدل چکے ہیں۔ لیکن اب مذہبی تجدید بھی ہو رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ثقافتی احیا بھی۔

اسلامی دنیا میں پچھلے بیس ایک سال سے ایک اور تحریک نے فروغ پایا ہے جس کے حامی اسلام کا اپنا ایک مخصوص تصور مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ جمال عبدالناصر کی زندگی تک یہ تحریک دبی ہوئی تھی، اس لیے کہ ان کی عوام میں مقبولیت کے مدنظر اس طرح کی کوئی تحریک عرب دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کا نعرہ عرب سوشلزم اور عرب قومیت تھا اور ان کا مقصد عرب قوم کو آگے لے جانا تھا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد اس تحریک نے زور پکڑا اور اب مسلمانوں پر اس کا گہرا اثر ہو رہا ہے۔ پولیٹکل سائنس کے بعض ماہرین اس تحریک کو Fundamentalism کا نام دیتے ہیں، جو میری رائے میں غلط ہے، دراصل یہ لفظ امریکہ سے شروع ہوا۔ اس طرح کی تحریک چاہے وہ مسلمانوں کی ہو یا ہندوؤں کی دراصل تجدید دین یا Revivalism ہے، ہندستان کے ہندوؤں میں بھی یہ Revivalism کہیں ہلکے رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے اور کہیں سختی لیے ہوئے۔

اخیر میں میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ آج کے حالات میں پھر سرسید جیسی شخصیت کی ضرورت ہے جو ہمیں صحیح راستہ دکھا سکے اور ترقی کے راستے پر لے جا سکے۔

(جامعہ ملیہ میں توسیعی خطبہ)

☆☆☆

Aligarh stands for

Gandhian Bhasha

Hindi=Urdu=Hindustani

ہندی=اردو=ہندستانی

- سویزرلینڈ چھوٹاسا ملک ہے، یوپی سے بھی چھوٹا ہوگا، ہمارے پورے ہندستان کا کیا مقابلہ !
- اس چھوٹے سے مگر دنیا میں مشہور ملک (یوپی سے چھوٹا) میں تین سرکاری زبانیں ہیں، یوپی میں ایک زبان، بہار میں ڈیڑھ۔ (اگر آدھا اردو کو مان لیں)
- تو کیا آپتّی ہے اگر ہم بھی ہندستانی کو اپنی ایک اور سرکاری زبان مان لیں:

  ہندستانی جو اردو اور دیوناگری دونوں اسکرپٹ میں لکھی جائے۔
- ہندستانی جو فلموں میں چلتی ہے، مشاعروں میں چلتی ہے، بازاروں میں چلتی ہے۔
- اگر ڈکشنری سے چھانٹ چھانٹ کے سنسکرت الفاظ (بجائے ہندستانی) کا پریوگ نہ ہو،

تو پھر، ایک ہی زبان رہ گئی: ہندستانی، گاندھی جی کی زبان !

NEW BOOKS ON/FROM ALIGARH

India Rises from the ashes

SIR SYED

As seen by The English and Anglo-Indian Contemporaries, 1886

Comp. by **Dr. Shayesta Khan**

A, long-awaited book is being presented to the academic world as a rare gift on Aligarh literature.

It was for the first time that an Indian was being referred to by a score of renowned English Newspapers, Viewspapers and Journals of India & the West.

The occasion was the publication of Colonel G.F.I. Graham's "The life and work of Sir Syed Ahmed Khan" in 1885. The publisher was London's William Blackwood & Sons.

It was a rare example that an *Indian* luminary becomes the subject of a full-fledged biography.

Some 20 essays or write-ups appeared about Graham's book which still seem to be fresh, re-visiting the situation as it was prevailing in the year that followed the foundation of Indian National Congress by yet another great Englishman, A. O. Hume.

Khuda bakhsh Library has been producing significant works by and on Sir Syed. 'Tafsir'' of Sir Syed was produced by the Khuda Bakhsh, for the first time long after it was first presented to the readers in parts and saw the light of the day during the life time of the Syed himself. Recently the Library has produced "Sir Syed ki Deeni barkatein", and "Sir Syed Aur Hindu Muslim Ittihad".

It is an opportunity, and a duty as well, to bring before the academic world, jewels of the past, which may create high spirits & inspire the new generation.

***

رشید احمد صدیقی

بنام

شیام کرشن بھٹناگر

رشید صاحب کے غیر مطبوعہ خطوط کی ڈسکوری، مرحومہ ڈاکٹر ذکیہ جیلانی کا کارنامہ

رشید احمد صدیقی اپنے عہد کے صاحب طرز نثر نگار اور وہ جن کے رگ رگ میں علی گڑھ بسا ہوا تھا، اور جو علی گڑھ تہذیب کے ایک اہم ستون تھے۔ اور دوسری شخصیت یعنی شیام کرشن بھٹناگر (م ۱۹۸۰ء تق)۔ جن کے نام یہ خط لکھے گئے ہیں وہ خود علی گڑھ اور سرسید کے پرستاروں میں تھے، یہ خطوط اس لئے بھی اہم ہیں کہ کسی بھی شخص کی لائف لکھنے کے لئے، اس کو لکھے گئے خط اور لکھنے والوں کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ رشید صاحب اور بھٹناگر صاحب دونوں ہی علی گڑھ اور سرسید کے یکساں متوالے تھے۔اور زیر نظر تحریروں میں یہ ذکر بھرا پڑا ہے۔

بھٹناگر صاحب کا اہم کارنامہ ''ہسٹری آف ایم اے او کالج،، علی گڑھ کے ایم اے او کالج کی ہسٹری ہے جو انہوں نے انگریزی میں لکھی اور جو خلیق احمد نظامی صاحب کی پرووسٹی کے زمانے میں طلبا کے چندے سے معمولی شکل وہیئت میں، بھٹناگر صاحب کی زندگی ہی میں، سرسید اکیڈمی سے چھپی تھی۔ اب یونیورسٹی صدی تقریبات کے موقع پر بھٹناگر صاحب کی کتاب کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے، اب سے پچاس ساٹھ برس بعد یونیورسٹی نے اسے اچھی ہیئت میں پیش کر دیا۔ جس سے مرحوم کی روح کو خوشی و تسکین ہو گی۔

ع اے وہ زود پشیماں کا پشیماں ہونا

رشید احمد صدیقی جیسا اور بھٹناگر جیسا ان دونوں کے سوا ایسا کوئی تیسرا علی گڑھ کا عاشق کم ہی ملے گا۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

اب ڈاکٹر ذکیہ جیلانی صاحبہ مرحومہ نے جو بھٹناگر صاحب کے نام رشید صاحب کے خطوط کو حرز جاں بنا کر رکھا تھا، اور ذکیہ جیلانی صاحبہ کی زندگی ہی میں شائع ہو چکے تھے، خدا بخش لائبریری نے دوسری بار ان کی اشاعت کا سامان کر دیا۔ امید ہے بھٹناگر صاحب اور رشید صاحب کی یہ خط و کتابت رشید ادبیات کا یادگار حصہ بنی رہے گی، اور دلچسپی سے پڑھی جاتی رہے گی۔

***

اردو کے عظیم نثر کے عظیم ترین نمونے

رشید احمد صدیقی

- شخصیت عطیہ الٰہی ہے جو ریاضت اور انتظار سے جلا پاتی ہے۔ شخصیت کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنادے۔
- عمر کا وہ دور کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا جب اچھے اور بڑے کاموں کے لئے جیتے رہنے، اور جان دینے دونوں کی یکساں خوشی ہوتی تھی۔
- اچھے مسلمان اور اچھے انسان کو میں نے ہمیشہ ایک دوسرے سے اتنا قریب پایا کہ کم سے کم میرے لئے ان میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا ہے۔
- جو شخص ہار جیت میں اپنا سہارا خود ہو، اس کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔
- زندگی میں طرح طرح کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے اکثر محسوس ہوا کہ مخاطب میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ہے۔ کوئی بڑا مخلص ملا تو اتنا ہی ثقہ اور روکھا پھیکا۔ کوئی ہنسنے ہنسانے والا ہوا تو یہ محسوس ہوا کہ اس میں گنوارپن بھی ہے۔ کوئی عالم فاضل ہوا تو اس میں نخوت، تنگ نظری اور کم ظرفی بھی کسی نہ کسی حد تک پائی گئی۔ اللہ والے ملے تو انھیں دنیا کے کام کا نہ پایا۔ کسی منکر یزداں کو ایسا نہ پایا جو کچھ اور نہیں رسول کی شرافت اور عظمت کا تو قائل ہوتا!
- ہر شخص کسی نہ کسی وظیفہ، عبادت یا مشن کے لئے خلق کیا گیا ہے جس کے مطابق اس مین استعداد ودیعت کی گئی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنا مشن یا اپنی عبادت دریافت کرے اور اسے پورا کرے۔ اسی عبادت میں اس کی نجات مضمر ہے۔
- مذہبی آدمی کو بالعموم اچھا انسان نہ پایا۔ مذہبی آدمی اکثر عقائد کی خانہ پری کرکے اعمال کی طرف سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ بات نہیں سمجھنا چاہتے کہ خدا نے اپنی نجات انسانوں کے سپرد نہیں کی ہے بلکہ انسانوں کی نجات انسانوں کے سپرد کی ہے خدا نے عقائد و عبادات کو خدمت خلق کے رستے سے نازل کیا ہے اور اسی معیار سے وہ ان کو پرکھے گا۔ عقائد اور اعمال کو یہ لوگ علحدہ علحدہ خانوں میں بانٹ دیتے ہیں حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ خدا کا فرمان اور منشا علحدہ علحدہ خانوں میں نہیں بٹا ہے۔

***

علیگ عزیزوں کے خط
From Alig Brotherhood

Prof. H. S. A. Yahya

Masha Allah very good initiatives. I fully indorse the idea of United States of India. I hope this comes true in our lifetime. We have very good example of Germany where East and West Germany United and progressing very well since then. I remember the Late Mulayam Singh Yadav had also given the concept of a Federation between Indian, Pakistan and Bangladesh. His opinion was that the position of these neighbors should stand as it was on 13 August 1947.

Asad Murtaza

Dear Abid Bedar
Many thanks for sending me a beautiful article ; very well written essay on Urdu.
Also a brief on Mr. Jinnah's early thoughts on Hindu- Muslim unity.
I am Asad Murtaza
Joined AMU, 1954, did my intermediate
B.Sc. In 1956
M.Sc (Physics) 1963, Stayed at Nasrullah Hostel, V.M.Hall ; 1956 to 1963
Currently living in LA, USA
Tel # 949-212-1003
Congratulations for your continued contribution.

Shaheer Khan, Ph.D.

Foster City, CA
Your Aligarh Diaspora online magazine issues are being circulated at AMU Network on Google groups. Network has a worldwide subscription of over 26,000 as of now. It is always a pleasure to read the articles and we look forward to next issue.

Shaheer

I am missing Aligarh Diaspora-16 and 17, Please forward to me. Also please include this email ID in your list.

Zameer Ansari

Thank you. I have forwarded the message to my sister. Unfortunately my younger brother who I have mentioned in the article passed away a couple of months ago. I have copied the article to Farida, my sister who lives in Zakir Bagh. Here in Dubai my son, his wife and their children will find it difficult to read Urdu. Hope you and Shaista are doing well. I will phone at a suitable time. Good wishes.

Zameer passed away, last month to rest peace.
- Editor

Arshi Khan

I received the Diaspora which covers articles on Urdu and Hindi as well as USI.
In addition to acknowledgement, thanks again.

Zafarul Islam Islahi

Shukriyah for Aligarh Diaspora-19
and Shakwah for not giving opportunity of mulaqaat during your Aligarh visit in the recent past.

Tariq Ghazi

Nineteenth issue of Aligarh Diaspora is received today 31 May 2023. Thank you.
Dr. Gopichand Narang was a controversial person and his article is evidence.

رضیہ حامد

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بارے میں:

''جب بولنے کھڑے ہوتے ہیں تو لگتا ہے، پوری اردو تہذیب بول رہی ہے۔ لہجے کی شائستگی و حلاوت، اتار چڑھاؤ، استدلال کی معقولیت، لفظوں کا انتخاب، خیالات کی فراوانی، بولنے کی روانی، ان سب کے امتزاج کا نام پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تقریر ہے''۔ ''سرمایہ فکر و نظر'':221۔

Dr. Rahat Abrar

Thank you the gem of Aligarh community.

Shad Naved

Thank you, Bedar sahib.

Prof. Latīf Hussain Shah Kazmi

Thanks for your attention and concern.

Shah Umer Ata

With due respect, kindly find attached herewith my "Urdu letter" for your view and future publication.
Furthermore, our hearts and minds are deeply disturbed and saddened in relation to the most recent tragic and disastrous train accident in India.
May God Almighty Showers His Blessings on all the concerned families, Ameen.
Best wishes.

جناب افضل عثمانی صاحب،

مدت ہوگئی آپ کی طرف سے ایک تحفہ ملا تھا، جو علیگ برادری میں خوشی خوشی پڑھا گیا، ڈائسپورہ کے ذریعہ ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں: آپ نے جو علی گڑھ تحریک پر کارنامہ انجام دیا ہے، اور جو کتابیں جمع کرلیں ہیں، اور پتہ نہیں کیا کیا کرلیا ہے، اس کی تفصیل برادری تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ تاکہ پڑھنے والے خوش ہوں، اور شکر گزار بھی۔ مہربانی کرکے ڈائسپورہ کے لئے لکھ دیں۔ (ایڈیٹر)

***

Aligarh stands for

INDO-PAK

AKHAND BHARAT

(USI)

United States of India

تمہارا ہاتھ بڑھا ہے جو دوستی کے لیے

مرے لیے ہے وہ اک یارِ غم گسار کا ہاتھ

تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمن بردوش

ہم آئیں صبحِ بنارس کی روشنی لے کر

ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر

پھر اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے

شاہ عمر عطا، واٹفورڈ، برطانیہ

4 جون 2023

قدرے توقف کے بعد اپنی مخصوص جہت کے جلو میں ''علیگڑھ ڈائسپورا'' کا انیسواں شمارہ موصول ہوا۔ ایک مسرت اور شادمانی کا احساس ہوا۔ کیونکہ مجھ جیسے ''حلقہ مادرِ درسگاہ'' کے معتقد ''چشم ما روشن دِل ما شاد'' کے مصداق علیگڑھ سے متعلق ہر قسم کی تحریر اور تقریر کے متلاشی رہتے ہیں۔ لیجئے وقت نکال کے شمارے کا ایک ایک لفظ پڑھ ڈالا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا عمیق اور دقیق مضمون یعنی ''اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک'' (ہندی اردو۔ سگی بہنیں) اپنے پیرائے میں خوب ہے۔ اتنی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ تو بہت چیدہ چیدہ شخصیات نے ادب کے منظر نامے پر قوس وقزح کے رنگ بکھیرے ہیں۔ احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے صدیوں پر محیط دونوں زبانوں کے دیرینہ تعلق، پرورش اور پرداخت کو انتہائی جامع اور مانع انداز میں الفاظ کا روپ عطا کیا ہے۔ محمد سعد سلمان، محمد عوفی، امیر خسرو اور قدیم شعراء کے حوالے بھی خوب ہیں جن سے آزاد مطالعے کے متلاشیوں کے لئے نت نئی راہیں وا ہوتی ہیں۔ علیگڑھ کی بہت سی خوبیوں میں اِس وصف کے کیا کہنے کہ وہ چن چن کر نایاب موتیوں کو اپنے تاج میں سجالیتا ہے اور گوپی چند نارنگ صاحب کو ''ڈاکٹر آف لٹریچر'' کی اعزازی ڈگری عطا کر کے علیگڑھ نے اپنی رخشندہ اور تابندہ روایات کو برقرار رکھا۔ دیکھا جائے تو یہ اقدامات تادیر یاد رکھنے والے ہیں۔

''علیگڑھ اسٹینڈز فار انڈو۔ پاک اکھنڈ بھارت۔ یونائٹڈ اسٹیٹس آف انڈیا (یو سی آئی)''۔ یہ نظریہ دونوں جانب ظلم و ستم، جبر و استبداد اور نسلی تعصب میں پسے اَن گنت لوگوں کی خواہشات کا حقیقی عکاس ہے مگر موجودہ عسکری، جغرافیائی، معاشرتی، معاشی، مذہبی اور لسانی حالات وواقعات کے تناظر میں ایسا ہونا حد درجہ مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا ہے۔ البتہ آنے والے وقت کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔

جی ایک اور اہم بات کا ذکر تو رہ ہی گیا۔ آپ نے میرے نام کے ساتھ (ڈاکٹر) تحریر فرمایا ہے۔ یہ آپ کا ظرف اور وسیع القلبی کا مظہر ہے۔ واللہ! میں اِس رُتبے کے لئے قطعی نااہل ہوں۔ یوں بھی لوگ یہ جاننے کے بعد شدید تنقید اور طنزیہ جملوں سے نوازیں گے۔ البتہ شعر و ادب، علم و آگہی اور دعوت و عزیمت سے قربت اور محبت مجھے ورثے میں ضرور ملی ہے۔ آپ کی جانب تمام حلقہ دانش و بینش کے لئے پرخلوص سلام اور دعاؤں کا گلدستہ پہنچے۔ الداعی الی الخیر۔

سلمیٰ کی بیس تیس سطریں کسی بھی موضوع پر، ڈائسپورہ کے لئے۔ (ایڈیٹر)

نوید مسعود

بہت بہت شکریہ، حسبِ سابق بہت دلچسپ مواد ہے۔ ذاکر صاحب کی یونین کی آخری تقریر کا اقتباس بالخصوص مزیدار ہے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ راوی طوطوں کی کہانی کا نفسِ مضمون سے ربط نہیں رکھ پائے یقیناً ذاکر صاحب نے کچھ اور وضاحت کی ہوگی جس سے اُس کتاب کے خلاف احتجاج کہانی کے پسِ منظر میں سعیٔ لاحاصل ثابت ہو۔ بہرحال یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، لطف آگیا۔ خدا حافظ